محمد رفیق الاسلام *

فسانۂ عجائب: ما بعد الطبیعیاتی مطالعہ

فسانۂ عجائب کا شمار اُردو کی معروف ترین داستانوں میں ہوتا ہے۔ یہ مرزا رجب علی بیگ سرور (م ۱۸۶۹ء) کی اوّلین داستان ہے جو نہ صرف خود معروف ہوئی بلکہ اِس نے اپنے تخلیق کار کی شہرت کو بھی چار چاند لگا دیے۔ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے بجا لکھا ہے:

> فسانۂ عجائب سرور کا پہلا تجربہ تھا اور اِس میں اُن کو اتنی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ وہ اگر اِس کے بعد کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی اُن کی شہرت میں کوئی کمی نہ آتی اِس لیے اُن کی کوئی دوسری کتاب شہرت و مقبولیت کے میدان میں فسانۂ عجائب کی گرد کو بھی نہ پاسکی۔[1]

رجب علی بیگ سرور ۱۲۰۰ھ بمطابق ۸۶-۱۷۸۵ء[2] میں لکھنو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما اور تعلیم و تربیت پائی۔ اُن کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ سرور عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاطوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اِس فنِ خطاطی میں وہ حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے۔ موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے۔ فنِ شعر میں آغا نوازش (۱۷۸۰-۱۸۵۴ء) تلمیذِ میر سوز (۱۷۲۴-۱۷۹۹ء) کے شاگرد تھے۔ مرزا غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) اور شرف الدین میرٹھی (م ۱۸۵۳ء) اُن کے دوستوں میں شامل تھے۔

بعض اہل ادب نے کان پور کو اُن کا وطن بتایا ہے جو اِس لیے بھی درست نہیں کہ کوئی اپنے

وطن کو اِس طور سے یاد نہیں کرتا جیسا کہ سرور نے کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اُنھیں ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں قتل کے مقدمے میں ملوث ہونے کی بنا پر نواب غازی الدین حیدر (م ۱۸۳۷ء) کے حکم سے لکھنؤ سے جلا وطن کیا گیا تھا۔ کان پور میں اُن کی بیگم مقیم تھیں اور اُن کے منھ بولے بیٹے احمد علی بھی کان پور ہی میں رہتے تھے۔ سرور نے فسانۂ عجائب بھی کان پور میں تحریر کی۔[3] رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق ذوالحجہ ۱۲۸۵ھ کے اواخر میں ۱۵ مارچ تا ۱۲ اپریل ۱۸۶۹ء کے درمیان پچاسی سال کی عمر میں رام نگر میں اُن کا انتقال ہوا اور رام نگر کے مشرق میں واقع پنج پٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔[4]

فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور نے ۱۲۴۰ھ بمطابق ۱۸۲۵ء میں کان پور میں حکیم سید اسد علی کی فرمائش پر لکھی لیکن وہ اِس داستان کا ڈول اِس سے کچھ عرصے پہلے لکھنو میں ڈال چکے تھے۔ وجہِ تالیف بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

> ایک روز چند دوست، باہم بیٹھے تھے، دِل گرفتہ، سینہ ریش اور اداس تھے۔ اِس زمرے میں ایک آشنائے بامزہ بندے کے تھے، انھوں نے فرمایا: اِس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفعِ کدورت وجمعیتِ پریشانیِ طبیعت ہو۔ فرماں بردار نے بجز اقرار، انکار مناسب نہ جانا؛ چند جملے گوش گزار کیے۔[5]

مذکورہ بالا بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ فسانۂ عجائب ان کی طبع زاد داستان ہے۔ اُردو داستان کے تمام محققین و ناقدین بھی اِسے سرور کی طبع زاد داستان ہی قرار دیتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سرور نے اپنی اِس داستان کے لیے واقعاتی مسالا اُردو کی دیگر داستانوں سے مستعار لیا ہے۔ اُردو کی چند معروف و غیر معروف داستانوں کے واقعاتی عناصر کا سراغ فسانۂ عجائب میں بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند دوسری داستانوں اور فسانۂ عجائب میں مماثلتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> فسانۂ عجائب تصنیف کرتے وقت سرور کی نظر میں تمام رائج الوقت قصے تھے۔ اُنھوں نے خاص طور پر گلشنِ نوبہار، بہارِ دانش، پدماوت اور داستانِ امیر حمزہ سے اپنا چراغ روشن کیا۔ غرض فسانۂ عجائب کے اہم واقعات میں

تبدیلیِ قالب کے علاوہ کوئی ایسا خیال نہیں جو فرسودہ قصوں سے ممتاز ہو۔[٦]

اگرچہ پلاٹ کے اعتبار سے بہت سے ناقدین نے فسانۂ عجائب پر اعتراض اُٹھایا ہے۔ لیکن اِس داستان کی خوبی اور شہرت کا سبب پلاٹ یا قصے سے زیادہ اِس کا اُسلوب ہے۔ اِس اُسلوب کے پیچھے داستان نگار کی شعوری مساعی کا دخل ہے جو اُس نے اپنی داستان کو میر امن کی باغ وبہار سے بہتر بنانے کے لیے کی ہے۔ اِس پر مستزاد سرور کی جودتِ طبع، بذلہ سنجی، بے ساختگی اور معاشرتی مرقع نگاری ہے جس نے اِسے بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ سید وقار عظیم کا تبصرہ قابلِ توجہ ہے:

> فسانۂ عجائب کا مصنف تو اپنے لیے اَزل سے حیاتِ جاودانی کی دستاویز لے کر آیا تھااور وہ اُسے ملی۔ اگرچہ اُس کی اِنشا پردازی کی وجہ سے نہیں اور نہ داستان گوئی کی بدولت۔ اِس لیے کہ قصے کے نقطۂ نظر سے فسانۂ عجائب میں کوئی ایسی بات نہیں جو دوسری داستانوں میں نہ ہو۔ بلکہ وہ طبع زاد داستان ہونے کے باوجود اِن داستانوں سے کم تر درجے کی ہے جو فارسی سے اُردو میں منتقل کی گئیں۔ اِس کی بقا میں مصنف کے غیر معمولی مشاہدے، ماحول سے گہرے ربط اور لگاؤ اور اُس کے فطری مزاج اور لطافتِ طبع کو بہت بڑا دخل ہے۔[۷]

اُردو کی دیگر داستانوں کی طرح فسانۂ عجائب بھی مابعد الطبیعیات کے زیرِ اثر آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ داستان نگار اور کردار چونکہ مسلمان ہیں اِس لیے اِسلامی مابعد الطبیعیات کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ وجودیات کے ضمن میں اِسلامی تصورِ خدا موجود ہے۔ داستان کے تمام کردار خواہ انسان ہوں یا غیر فطری عناصر اور پرندے سب ذات واحد پر کامل یقین رکھتے ہیں جو سب کی پالنہار، رزق، اولاد، حیات وممات کی مالک اور سمیع وبصیر ہے۔ وجودیاتی نظریات کے ضمن میں داستان نگار نے قرآنی آیات کا استعمال کیا ہے:

> ان اللّٰہ علی کل شیٍ قدیر۔[۸]

اِنسان اپنی حاجتوں اور ضروریات کی تکمیل میں جب اپنی کاوش کو بارآور ثابت نہیں پاتا تو اِس ماوراء النظر ذات سے امید لگاتے ہوئے دستِ دعا دراز کرتا ہے۔ یہاں دعاؤں کے لیے بھی قرآنی آیات کا سہارا لیا گیا ہے:

رب لا تذرنی فرداً و انت خیر الوارثین۔[9]

رب هب لی من لدنك ولیاً۔[10]

انسان کے علاوہ جانوروں کا بھی اُس اَن دیکھی طاقت پر یقین ہے اور وہ اپنے اِس یقین میں اِس قدر پختہ ہیں کہ انسانوں کو تبلیغ و تلقین کرتے نظر آتے ہیں:

طوطا یہ قصہ تمام کر کے بولا! جانِ عالم! جو لوگ ثابت قدم ہیں ان کا ہر وقت اللہ یار ہے۔[11]

فسانۂ عجائب کے تصورِ کائنات میں بیشتر تقدیر ایک اہم عنصر ہے۔ یہاں نصیبوں کا لکھا انسان کی حیات پر گہرا اثر ڈالتا ہے:

دیکھو! ابھی آگے تقدیر کیا کیا دکھاتی ہے۔[12]

انسان اپنی تقدیر کے سامنے مجبورِ محض ہے، تقدیر کے سامنے تدبیر کی ذرا بھی نہیں چلتی:

تدبیر خلافِ تقدیر سراسر بے کار ہے۔[13]

جو نصیب میں لکھا ہوا ہوتا ہے وہ اٹل ہے اور ہو کر رہتا ہے:

قضا سے کیا چارہ؟[14]

غربت و امارت، بلندی و پستی، عزت و عظمت یہ سب نصیب میں لکھی ہوئی چیزیں ہیں:

نصیب ایسا جاگتا تھا مٹی کو چھوتا، سونا ہاتھ آتا تھا۔[15]

تقدیر منشاے الٰہی کے تابع ہے اِس لیے انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ ذاتِ ربانی پر بھروسا رکھے تو کامیابی اُس کا مقدر ٹھہرتی ہے تبھی تو شہزادہ جان عالم ہر مہم میں کہتا ہے:

توکلت علی اللہ۔[16]

تقدیر پر ایمان کے ساتھ ساتھ کرداروں میں توہم پرستانہ خیالات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ داستان نگار کا خیال ہے کہ طبعی اجسام کے ماوراء الطبع برے اثرات بھی اِنسان کے نصیب پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بدشگونی کے واقعات عام طور پر اِنسان کے ساتھ اُس وقت پیش آتے ہیں جب اُس کے ساتھ یا اس کی کسی عزیز ہستی کے ساتھ کوئی ناخوشگواری متوقع ہوتی ہے۔ جب جان

عالم پر مصیبت پڑتی ہے تو ملکہ مہر نگار کے دِل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ عجیب طرح کے واقعات ہوتے ہیں جن سے وہ بدشگونی اَخذ کرتی ہے اور انجمن آرا سے کہتی ہے:

خدا خیر کرے آج بہت شگونِ بد ہوئے تھے۔ صبح سے داہنی آنکھ پھڑکتی تھی، راہ میں ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی، اپنے سایہ سے بھڑکتی تھی، خیمے میں اُترتے وقت کسی نے چھینکا تھا۔ خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا۔[17]

خیر و شر کی اس آویزش میں شہزادہ خیر کا نمائندہ ہے جو اپنے مقصد کی بار آوری کے لیے شر کے نمائندوں سے برسرِ پیکار ہے۔ مجسم شر کردار شیطان، خیر کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے:

شیطان کو اِنسان دُور نہ جانے۔[18]

شیطان کے ساتھ اُس کے چیلے، جادوگر، جنات اور وزیر زادے جیسے اِنسان اپنی سفلی و ناجائز خواہشات کے لیے خیر کے راستے کی رکاوٹ نظر آتے ہیں۔ اِس داستان میں مافوق الفطری فضا تخلیق کی گئی ہے، جہاں طاقت سے زیادہ ماورائی علوم کے ذریعے فتح و شکست کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہاں عامل، نجومی، جادوگر اور ساحر ہیں جو اپنے اپنے فن میں یکتائے زمانہ ہیں:

ظل سبحانی عامل بے بدل، ساحر بے مثل ہیں، علوی، سفلی سب کچھ لکھا پڑھا۔[19]

یہاں ایسے کردار بھی ہیں جو بیک وقت نورانی اور سفلی علوم پر دسترس رکھتے ہیں:

یہ مرد بزرگ، نیک صفات، فن سحر کے سوا، عامل اسمِ ذات کا تھا۔[20]

سفلی اور مذموم علوم کا توڑ قرآن مجید کی آیات اور اسمائے الٰہی سے کیا جاتا ہے:

ہر خانے میں اسمائے الٰہی مع ترکیب و تاثیر تحریر تھے۔[21]

اگرچہ آخری اور حتمی فتح حق ہی کو حاصل ہوتی ہے اور وزیر زادہ جس کی روح بکری کے جسم میں قید ہوتی ہے، قتل کر دیا جاتا ہے لیکن اِس سب کے باوجود رجب علی بیگ سرور خیر و شر کے معرکے کو اُس انداز میں تحریر نہیں کر سکے جو داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں نظر آتا ہے۔ یہاں مقابلہ جاتی فضا پھسپھسی اور کمزور ہے۔ مرکزی کردار شہزادہ جانِ عالم نرگسیت کا شکار ہے۔ اتنے بڑے جادوگروں، جنات اور مافوق الفطری آفات سے مقابلہ کرنے کے لیے مرکزی کردار میں جو خوبی اور قوت

ہونی چاہیے وہ جانِ عالم میں مفقود ہے۔ جادوئی ماحول بھی اُس قدر زور آور نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ آرزو چودھری کی تنقید بجا ہے:

> فسانۂ عجائب کا جادوئی ماحول اور طلسمی فضا بھی بے رنگ، پھیکی پھیکی اور دھندلی دھندلی ہے۔ ساحر اور جادوگرنیاں تو ہیں لیکن نحیف و ناتواں، اِن میں وہ رعب و دبدبہ نہیں جو جادوگری کی آبرو ہے، فوق فطرت عناصر یہاں تک کہ ہیرو بس یونہی سا ہے، اِس میں دوسری داستانوں والا دم خم نہیں۔[۲۲]

اِس داستان کا تصورِ زمان ومکان بھی دیگر متقدم داستانوں سے مشابہ ہے۔انسان کا مکان پر تصرف اور اُس کے لیے فاصلوں کا مٹ جاناوہ تصور ہے جو اُردو داستانوں میں عام پایا جاتا ہے۔ اِس کے لیے داستان نگار کسی نہ کسی غیر فطری عنصر کو درمیان میں لا کر فاصلے سمیٹ دیتا ہے۔کبھی تو مرکزی کردار کسی کنویں یا تالاب میں داخل ہوتا ہے پھر کہیں سے کہیں جانکلتا ہے۔کبھی جنات اور پریاں اُسے اُٹھا کر لمحوں میں سیکڑوں میل دور پہنچا دیتے ہیں اور کبھی وہ کسی پرندے میں تبدیل ہوکر فاصلہ طے کرجاتا ہے۔ یہاں تیسری صورت نظر آتی ہے جب شہزادہ جانِ عالم اور انجمن آرا طوطے بنے سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں سفر کو علامت کے طور پر بھی برتا گیا ہے جو انسان کو اُس کے مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ اِس داستان میں وقت کا بھلا اور برا ہونا اور اِس کے انسانی زندگی پر اثرات وغیرہ سے متعلق نظریات، ہندی مابعد الطبیعیاتی نظام فکر سے متاثر ہیں۔ یہاں ہر کام کرنے سے پہلے اُس کے لیے مناسب وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں رمال، نجومی، پنڈت، جفر دان اور ہیئت و ہندسہ اور نجوم کے ذریعے احوال کی پیش گوئی کرنے والے موجود ہیں جو وقت سے پہلے حالات سے باخبر کردیتے ہیں۔ داستان نگار نے اِس ضمن میں ستاروں اور برجوں کے نام تک گنوائے ہیں:

> نجومی، پنڈت، جفردان حاضر ہوئے۔ کسی نے قرعہ پھینکا، کسی نے زائچہ کھینچا شکلیں لکھیں، کسی نے پوتھی کھولی، کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا، کوئی تلا، برچھیک، دھن، مکر، کنبھ، مین، لیکھ، برکھ، متھن، کرک، سنگھ، کیناں، گن بچار کرنے لگا۔ کوئی مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، قمر، زحل کا حال مع گردش برج کہہ کے حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، قوس، عقرب، جدی و حوت اور میزان دے کر شمار

کرنے لگا۔[۲۳]

روح مابعد الطبیعیات کا اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ اس موضوع کو غیر عقلی رنگ دے کر داستان میں اسی طرح پیش کیا گیا ہے جیسے روح کا منتقل کرنا نہایت آسان اور انسانی فعل ہے ۔ اِسلامی عقیدہ ہے کہ روح کا انسانی جسم میں آنا اور جانا صرف امرِ خدائی ہے۔ جب کہ ہندی عقیدہ ہے کہ سادھو، پنڈت اور جوگی ارتقاے طاقتِ روحانی کے سبب اپنی روح پر قابو پا لیتے ہیں اور پھر وہ جس مردہ جسم میں چاہتے ہیں اپنی روح منتقل کر لیتے ہیں۔ اُردو کی ہندی الاصل داستانوں طوطا کہانی ، بیتال پچیسی ، سنگھاسن بتیسی میں یہ نظریہ عموماً پایا جاتا ہے۔ یہاں شہزادہ جانِ عالم بھی اِس فن سے آگاہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

جس کے قالب میں چاہوں اپنی روح لے جاؤں۔[۲۴]

پھر اُس نے یہی فن وزیر زادے کو سکھا دیا جس نے دغا دیتے ہوئے شہزادے کے جسم پر قبضہ کرلیا:

> شہزادہ زمین پر لیٹا، بندر اٹھ کھڑا ہوا، فوراً وہ کورنمک زمین پر گرا، اپنی روح جان عالم کے قالبِ خالی میں لا کھڑا ہوا اور کمرے سے تلوار نکال، اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔[۲۵]

تبدیلیِ قالب کے اِس نظریے کے ذریعے داستان نگار نے واقعاتِ قصہ کو آگے بڑھانے اور تجسس کی فضا قائم کرنے کا کام لیا ہے۔ تبدیلیِ قالب کا یہ عمل اپنے اندر گہری معنویت بھی رکھتا ہے کہ انسان کو اپنے مقصد میں کامیابی اور حصولِ مراد کے لیے ہر انتہائی قربانی سے گذرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہ انسان کی اپنی ذات کی قربانی بھی ہوسکتی ہے۔

خیر و شر کے ساتھ ساتھ حسن و جمال بھی فلاسفۂ یونان اور اُن کے مابعد فلاسفہ میں ایک مقبول مابعد الطبیعیاتی مبحث رہا ہے۔ اَدب خواہ شاعری ہو یا نثر ذکرِ جمال کے بغیر منازلِ ارتقا طے نہیں کرسکتا۔ داستان کی بنیاد ہی جمالیات پر ہوتی ہے۔ جمالیات کے ضمن میں اگرچہ مادی اور طبعی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے مگر اُس کے اثرات غیر طبعی اور مابعد الطبیعیاتی ہوتے ہیں۔ تخیل کو مہمیز کرنے اور

داستان میں تجسس اوردلچسپی لانے کے لیے جمالیاتی تذکرہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہر داستان حسن و جمال کے ذکر کے ساتھ ہی آگے بڑھتی ہے جوعشق کا موجب و باعث بنتا ہے:

> خوب صورتی عجب چیز ہے، اس کا دوست طالب، دشمن مطلوب ہے، حسن خوب سب کو مرغوب ہے، جہاں کو عزیز ہے۔[۲۶]

فسانۂ عجائب میں بھی داستانوی بُنت میں صحیح معنوں میں جان اس وقت پڑتی ہے جب طوطا جانِ عالم کے سامنے انجمن آرا کے جمال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ انجمن آرا کے دم بہ خود کر دینے والے حسن کا یہ تذکرہ شہزادے کو ایک نئی دنیا سے روشناس کراتا ہے جوعشق کا جہان ہے، جہاں انسان آگ کے دریا سے گذر کر گلزارِ نعمت سے شاد کام ہوتا ہے۔ جہاں حصولِ تسکینِ قلب کے لیے دکھوں کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں۔عقل اورعشق کا اَزل سے بیر ہے۔عقل انسان کو مادی سکون اورعشق اُسے روحانی مسرتوں کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ یہاں بھی عقل شہزادے کو روکتی ہے جب کہ عشق اُس کی حوصلہ افزائی کرتا نظر آتا ہے:

> عقل کہتی تھی: ماں باپ کی مفارقت اختیار نہ کرو، سلطنت سی شے نہ چھوڑو، عشق کہتا تھا: ماں باپ کس کے؟ بادشاہت کیسی؟ سر رشتۂ الفتِ غیر توڑو۔[۲۷]

جذبۂ عشق عقل کو ہزار پردوں میں چھپا دیتا ہے۔ جوعشق میں ڈوب گیا اُسے ہر مرض کی تکلیف سے نجات مل گئی کیونکہ عشق خود ہزار بیماریوں سے بڑی بیماری ہے۔ جسے کسی دوا سے افاقہ نہیں ہوتا اور نہ کوئی تسلی روحانی سکون دے سکتی ہے وہ مرض صرف عشق ہی ہے۔تبھی تو داستان نگار کہتا ہے:

> سینہ آتشِ غم سے جل کے تنور ہوتا ہے۔ آنکھوں سے دریا ابلتے ہیں۔ طوفان کا ظہور ہوتا ہے۔عقل کا چراغ گل تب فراق سے دل جلتا ہے۔شجر تمنا بے برگ و بار رہتا ہے۔ جوانی کا گھن پیری تک ادھیڑ بن رہتی ہے۔[۲۸]

شہزادہ جانِ عالم بھی نادیدہ محبوب کا عاشق ہو کر راہِ عشق اختیار کرتا ہے۔ وہ مال و دولت اور سلطنت کسی بھی چیز کی پروانہیں کرتا اُس کے پیشِ نظر مقصد حصولِ محبوب ہی ہے جس کے لیے وہ آنے والی مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں آتی ہیں۔کبھی جنات اور پریاں، کبھی جنگل اور جنگلی بلائیں، کبھی شہپال جادوگر کی بیٹی اور

کبھی ملکہ مہر نگار جیسی حسین شہزادی، مگر شہزادے کا مقصد نہ تو حصولِ دولت ہے اور نہ ہی حصولِ حسن، وہ ایک نادیدہ ہستی پر عاشق ہے اور اُسی کا حصول اُس کا نصب العین ہے تبھی تو وہ شہپال جادوگر کی بیٹی کو انکار کرتے ہوئے کہتا ہے:

> یہی شرطِ محبت ہے کہ ایک شخص کا نام خراب کرکے، جہاں آسائش ملے، وہاں بیٹھ رہے؟ فکر سلطنت، جستجوے دولت میں سربہ صحرا نہیں ہوا ہوں، جو تیری جاہ وثروت پر اکتفا کروں۔ تجھے معلوم ہوگا اللہ کی عنایت سے گھر کی حکومت چین کرنے کو کافی تھی۔[۲۹]

جانِ عالم کے اِس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو فہم وفراست سے عاری ہے اور نہ ہی حسن کا پجاری ہے۔ وہ ایک ایسا جی دار شخص ہے جسے اپنے مقصد سے عشق ہے اور حصولِ مقصد میں آنے والی کوئی بھی رکاوٹ اُسے گوارا نہیں۔ کلثوم نواز کا یہ اعتراض بے جا ہے کہ:

> جانِ عالم ایک ایسا شہزادہ ہے جو صرف ایک پرندے کی شہ پر گھر بار، ماں باپ، ملک ومال اور چہیتی بیوی کو چھوڑ کر انجمن آرا پر نادیدہ عاشق ہوکر جنگلوں کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔[۳۰]

نادیدہ ہستی کا عشق اور پھر اُسی عشق میں راہِ مسافرت اختیار کرتے ہوئے جنگلوں کی ''خاک چھاننا'' اِسلامی تصوف کی چودہ سوسالہ تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اِسلامی تاریخِ تصوف میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جیسے بزرگ کا نام بھی آتا ہے جو شاہِ وقت تھے مگر عشقِ الٰہی میں سلطنت چھوڑ کر جنگلوں کی طرف نکل گئے اور اَحد اَحد پکارتے پھرے۔ جانِ عالم کے کردار پر بھی اِسلامی تصوف کے اثرات ہیں۔ تاج وتخت چھوڑنا، اللہ کی مدد پر بھروسا رکھنا، جاہ و مال کی طمع کا دِل سے نکال دینا اور شر کی نمائندہ طاقت کو شکست دینا وغیرہ وہ علامتیں ہیں جو جانِ عالم کو صوفی منش بھی ثابت کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے جانِ عالم کے کردار کو ایک تمثیلی کردار قرار دیا ہے۔[۳۱] یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فسانۂ عجائب کا تصورِ عشق اُردو کی دیگر داستانوں داستانِ امیر حمزہ اور نو آئینِ ہندی سے افضل ہے کیونکہ یہاں عشق جنسی جذبہ نہیں بلکہ ایک مقصودِ روحانی ہے جس کا حصول داستان کا ہیرو اپنے لیے ضروری تصور کرتا ہے۔

اِس داستان میں جہاں قرآنی آیات اور اِسلامی عقائد و نظریات کے ذریعے اِسلامی مابعدالطبیعیاتی عناصر کو شامل رکھا گیا ہے وہاں روح اور مافوق الفطری عناصر کے ضمن میں ہندی مابعدالطبیعیاتی تفکرات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔حسن و خوب صورتی سے متاثر ہو کر عشق و محبت جیسے فطری اور روحانی جذبے کی شدت اور پھر اِس جذبے کے بل بوتے پر شر کی قوتوں کو شکست دیتے ہوئے خیر کی کامل فتح داستان کو زیادہ دلچسپ بنا دیتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

* استاد، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، بغداد روڈ، بہاول پور۔

۱۔ نیر مسعود رضوی، رجب علی بیگ سرور:حیات اور کارنامے (الٰہ آباد: شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونی ورسٹی، ۱۹۶۷ء)، ص۱۲۶۔

۲۔ رام بابو سکسینہ کے مطابق رجب علی بیگ سرور کا سالِ پیدائش ۰۲–۱۲۰۱ھ ہے، بحوالہ تاریخِ ادبِ اُردو، ص۳۸۲۔ جب کہ ہم نے یہاں رشید حسن خاں کی تحقیق سے اتفاق کیا ہے، بحوالہ مقدمہ فسانۂ عجائب، ص۳۱۔

۳۔ جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اُردو، جلد سوم (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء)، ص ۶۰۶۔

۴۔ رشید حسن خاں، ''مقدمہ''، فسانۂ عجائب از مرزا رجب علی بیگ سرور (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۸ء)، ص۳۲۔

۵۔ مرزا رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب، مدون رشید حسن خاں (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۸ء)، ص۲۶، ۲۷۔

۶۔ گیان چند جین، اُردو کی نثری داستانیں (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۹ء)، ص۳۴۴۔

۷۔ سید وقار عظیم، ہماری داستانیں (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص۳۵۳۔

۸۔ مرزا رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب، مدون رشید حسن خاں، ص۱۰۸۔

۹۔ ایضاً، ص۳۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص۳۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص۳۳۵۔

۱۲۔ ایضاً، ص۱۲۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص۱۸۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص۱۹۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۶۴۔

۱۷۔ ایضاً، ص۱۹۸۔

۱۸۔ ایضاً،ص۱۹۵۔

۱۹۔ ایضاً،ص۱۹۵۔

۲۰۔ ایضاً،ص۲۵۰۔

۲۱۔ ایضاً،ص۶۸۔

۲۲۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان(لاہور:عظیم اکیڈمی،۱۹۸۸ء)،ص۴۴۴۔

۲۳۔ مرزا رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب، مدون رشید حسن خاں،ص۸۴۔

۲۴۔ ایضاً،ص۱۹۷۔

۲۵۔ ایضاً،ص۱۹۸۔

۲۶۔ ایضاً،ص۸۳۔

۲۷۔ ایضاً،ص۱۱۵۔

۲۸۔ ایضاً،ص۴۵۔

۲۹۔ ایضاً،ص۶۳۔

۳۰۔ کلثوم نواز، رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء)،ص۱۴۱۔

۳۱۔ رفیع الدین ہاشمی، سرور اور فسانۂ عجائب(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۳ء)،ص۱۴۲۔

مآخذ

جالبی،جمیل ۔ تاریخ ادبِ اُردو ۔ جلد سوم ۔ لاہور:مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء۔

جین، گیان چند۔ اُردو کی نثری داستانیں ۔کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان،۱۹۶۹ء۔

چودھری، آرزو ۔ داستان کی داستان ۔ لاہور:عظیم اکیڈمی،۱۹۸۸ء۔

خاں،رشید حسن ۔''مقدمہ''۔ فسانۂ عجائب ۔ از مرزا رجب علی بیگ سرور ۔ لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب ،۲۰۰۸ء ۔

رضوی، نیر مسعود۔ رجب علی بیگ سرور:حیات اور کارنامے ۔الہ آباد: شعبۂ اُردو الہ آباد یونی ورسٹی، ۱۹۶۷ء۔

سرور، مرزا رجب علی بیگ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مدون رشید حسن خاں ۔لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب ،۲۰۰۸ء ۔

عظیم،سید وقار۔ ہماری داستانیں۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء۔

نواز،کلثوم ۔ رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء۔

ہاشمی، رفیع الدین ۔ سرور اور فسانۂ عجائب ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۳ء۔